DR. ABID RAZA BEDAR
KATRA, RAMPUR - 244901 (U.P.)

Date of Publication : 16-08-2015 PRICE Rs. 3/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01
ON 17-18 August 2015, R.N.I No. 2186/57
POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2015-17
Licensed to Post Without PrepaymentU (C) 160/2015-17

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 August2015
Issue: 32, Vol.: 74

۲۲ تا ۲۸ / اگست ۲۰۱۵ء
شمارہ نمبر: ۳۲، جلد نمبر: ۷۴

واقعہ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے بعد سے ہی ہندستان کی غلامی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ بعد ازاں 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی نے ہندستان کو سیاسی طور پر باقاعدہ برٹش حکومت کی ایک کالونیل ریاست میں تبدیل کر دیا۔ غدر کے شعلے بجھ گئے مگر راکھ میں چند چنگاریاں دبی رہ گئیں اور وقت کی آندھیوں کے ساتھ رفتہ رفتہ یہ چنگاریاں دوبارہ شعلوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ بالآخر 90 سال کی طویل جد وجہد اور لاکھوں انسانوں کی قربانیوں کے بعد 1947 میں ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔

آزادی کی اس طویل جنگ میں سیاسی تحریکوں کے تحت جہاں ہزاروں لاکھوں آزادی کے متوالوں نے اپنی

تحریکِ آزادی اور اُردو افسانہ

سلام بن رزاق

جان کا خراج ادا کیا وہیں ادب اور آرٹ نے کروڑوں انسانوں کے ذہنوں کو ہموار کرنے، اُن کے دلوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کرنے اور اُنھیں اس انقلابی جد وجہد میں شریک ہونے کی ترغیب دینے کا اہم رول ادا کیا ہے۔

ہندستان کی تحریک آزادی سے اردو زبان کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ شاعری میں اٹھارہویں صدی کے اواخر ہی سے اس رجحان کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں۔ مگر افسانے میں یہ رجحان ذرا دیر میں داخل ہوا۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اردو میں پہلا افسانہ کس نے اور کب لکھا؟ ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ افسانے نے سب سے پہلے پریم چند کی انگلی پکڑ کر غیر منقسم ہندستان کے گاؤں کی گلیوں میں چلنا سیکھا تھا۔ پریم چند اردو فکشن کا سب سے بڑا نام ہے۔ جس طرح حالی نے بہت پہلے اصلاحی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی اسی طرح پریم چند نے بھی سماجی اصلاح کے نقطۂ نظر سے تاریکی اور

توہم پرستی کا ذکر ہے۔ ان تاریخی افسانوں کے ذریعے پریم چند نے اپنے قارئین کے دلوں میں حب وطن کی چنگاری کو بھڑکایا اور وطن کی گزشتہ عظمت اور کارناموں کو بیان کرکے قوم کی رگوں میں لہو کی رفتار کو تیز کر دیا۔ اگرچہ ان افسانوں کا تحریک آزادی سے براہ راست تعلق نہیں ہے مگر قومی اصلاح اور ان کے شعور کی تہذیب میں یہ افسانے ایک اہم کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

اس دوران پہلی جنگ عظیم نے ہندستانی زندگی کے خاص معاشرتی ڈھانچے میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ شہروں کارخانوں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ گاؤں میں کسان اور مہاجن کا مسئلہ شہر میں کارخانہ دار اور مزدور کی آویزش کی صورت میں سامنے آیا۔ سیاسی تحریکیں عروج پر تھیں۔ آزادی کا صور پھونکا جا چکا تھا اور لوگ برٹش سامراج کے خلاف

اصلاحی افسانوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں پانچ کہانیاں شامل ہیں، جن میں سے تین کہانیاں 'دنیا کا انمول رتن'، 'یہی ہے میرا وطن' اور 'عشق دنیا اور حب وطن' آزادی کی تڑپ اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں۔ ہر چند یہ کہانیاں ہمیں ہیئت، اسلوب اور تکنیک کی بنیاد پر بہت معیاری نہ معلوم ہوتی ہوں مگر ان میں پوشیدہ جذبے کی صداقت اور حصول آزادی کی والہانہ تڑپ انھیں ایک تاریخی اعتبار ضرور بخشتی ہیں۔ یہ زمانہ قوم و ملک میں سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ تحریک آزادی کی لہر ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ بحیثیت ادیب پریم چند کا بھی ان سب سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔ 'سوز وطن' کی اشاعت کو دراصل جنگ آزادی میں پریم چند کی راست شرکت سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ان میں شامل افسانوں کو ایک طرف امرت رائے نے درد کی ایک چیخ کہا تو دوسری جانب فراق گورکھپوری نے انھیں ایک فیکٹری کو اڑانے کے لیے ایک چھوٹے سے بم سے تعبیر کیا۔ خود پریم چند نے اس کے دیباچے میں لکھا:

"اب ہندستان کے قومی خیالات نے بلوغیت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھا دیا ہے اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے ہیں، کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا اثر ہمارے ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اسی اثر کا آغاز ہیں۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔"

'سوز وطن' کی کہانیوں میں 'دنیا کے انمول رتن' کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کہانی اُس زمانے کے مقبول عام اسلوب یعنی داستانوی انداز میں لکھی گئی ہے، جس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ قارون کا خزانہ، تاج خسرو، جام جم، زر پرویز، انسانی جذبات میں تاسف اور معصومیت کے آنسو، وفا شعاری اور قربانی کی راکھ، ان تمام چیزوں سے جو شے بیش بہا ہے "وہ آخری قطرۂ خون ہے جو وطن کی حفاظت میں گرے۔" یہ چند مقصدیت اس کہانی میں شروع سے آخر تک حاوی نظر آتی ہے مگر اس عہد کے تناظر میں دیکھیں تو اس کی اہمیت ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مجموعے کی دوسری کہانی 'یہی ہے میرا وطن' امریکہ سے اپنے وطن ہندستان لوٹنے والے ایک ایسے شخص کے احساسات پر مبنی ہے جسے اپنے وطن کے مقابلے میں بیوی، بچے، دوست احباب ہر رشتہ ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ تیسری کہانی 'عشق دنیا اور حب وطن' اٹلی کی جنگ آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ اس کہانی میں بھی جمہوری نظام کے قیام کے لیے کی جانے والی جد وجہد اور قربانی کو موضوع بنایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آخری سانس لیتے ہوئے بھی وطن کی فلاح کے خیال سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ بالآخر 'سوز وطن' پر باغیانہ خیالات کا الزام عائد کرتے ہوئے برٹش حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔ پریم چند اب تک نواب رائے کے نام سے لکھتے تھے۔ دیا نرائن نگم کے مشورے سے انھوں نے نواب رائے کو خیر باد کہا اور اپنا نیا قلمی نام 'پریم چند' اختیار کیا اور ذرا سا دم لے کر دوبارہ اپنے ادبی سفر پر گامزن ہو گئے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پریم چند کے تاریخی اور اصلاحی افسانوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس عرصے میں پریم چند نے 'پریم پچیسی'، 'پریم بتیسی' اور 'پریم چالیسی' کے بعض افسانے لکھے جن میں آبھا، رانی سارندھا، راجہ ہردول اور

صف آرا ہو چکے تھے۔ پچھلے عشرے میں ذہنی بیداری پیدا ہو چکی تھی، مذہبی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل پر لوگوں نے نئے سرے سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ کارل مارکس، فرائڈ اور برٹرنڈ رسل کی تعلیمات عام ہو رہی تھیں۔ لوگوں کا سماجی شعور بیدار ہونے لگا تھا۔ سوشلزم اور مارکسزم کے نظریات براہِ راست لوگوں کی فکر پر اثر انداز ہونے لگے تھے۔ اردو افسانے کی تاریخ میں یہ زمانہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی زمانے میں ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا، نگار اور زمانہ جیسے اہم رسالے جاری ہوئے اور ان رسالوں میں اس عہد کے افسانہ نگاروں نے بکثرت افسانے لکھے۔ پریم چند نے 1921 میں سرکاری ملازمت کا طوق گلے سے اتار پھینکا اب اُن کی اصلاحی تحریک سیاست سے مل کر دو آتشہ ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے عیدگاہ، مس پدما، شطرنج کے کھلاڑی، دودھ کی قیمت، سوا سیر گیہوں، نئی بیوی، نمک کا داروغہ، پوس کی رات، بڑے گھر کی بیٹی اور بازار وغیرہ میں سیاسی اور سماجی حقیقت پسندی کی بے لاگ ترجمانی کی۔ ان میں سے بیشتر افسانوں میں سماجی اور معاشرتی اصلاح کا مقصد واشگاف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مگر بعض افسانے ایسے ہیں جن میں جذبۂ آزادی کی لہر بھی موجِ تہ نشیں کی طرح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ مثلاً 'شطرنج کے کھلاڑی' ہی کو لیا جائے جو بظاہر انیسویں صدی کے ہندوستانی معاشرے کے زوال کی عبرت ناک تصویر پیش کرتا ہے مگر اس کے پس پشت افسانہ نگار ہندوستانیوں کی غیرت کو للکارنا چاہتا ہے، وہ بتانا چاہتا ہے کہ ہندوستانی محض برف کے تودے نہیں ہیں ابھی اُن کے اندر ہمت اور جواں مردی کی آگ پوشیدہ ہے مگر افسوس کہ وہ اس آگ سے بجائے راون کی لنکا کو پھونکنے کے خود اپنی ہی آبرو کو جلا کر بھسم کر دیتے ہیں۔ یہ افسانہ تحریک آزادی کے حق میں نعرہ نہیں چیخ بن کر ابھرتا ہے ایک درد ناک چیخ۔ ان کے علاوہ جیل بھاڑے کا ٹٹو، قاتل اور ستیہ گرہ افسانے براہِ راست سیاسی اثرات کے تحت لکھے ہوئے افسانے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کا سفر پورے شباب پر تھا کہ 1932 میں 'انگارے' کی اشاعت نے اردو افسانوی ادب میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانے کی جو بساط بچھنے والی تھی 'انگارے' اُسی کا پیش خیمہ تھا۔ 'انگارے' میں اس عہد کے باغی ادیبوں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی دس کہانیاں شامل تھیں جس میں زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرے اور اس عہد کے باغیانہ ذہن کی عکاسی کی گئی تھی۔ سجاد ظہیر کے الفاظ میں ان کہانیوں میں سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان کا بے باکانہ اظہار تھا۔

'انگارے' کی جرأت و بیباکی نے نئے لکھنے والوں کے سامنے نئی نئی راہیں کھول دیں اور اُس کے بعد آنے والے ترقی پسند افسانہ نگاروں پر 'انگارے' کے دور رس اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ہندوستان کی تحریک آزادی سے اردو زبان کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ شاعری میں اٹھارہویں صدی کے اواخر ہی سے اس رجحان کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں۔ مگر افسانے میں یہ رجحان ذرا دیر میں داخل ہوا۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اردو میں پہلا افسانہ کس نے اور کب لکھا؟ ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ افسانے نے سب سے پہلے پریم چند کی اُنگلی پکڑ کر غیر منقسم ہندوستان کے گاؤں کی گلیوں میں چلنا سیکھا تھا۔ پریم چند اردو فکشن کا سب سے بڑا نام ہے۔ جس طرح حالی نے بہت پہلے اصلاحی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی اسی طرح پریم چند نے بھی سماجی اصلاح کے نقطۂ نظر سے تاریخی اور اصلاحی افسانوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوزِ وطن' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں پانچ کہانیاں شامل ہیں، جن میں سے تین کہانیاں 'دنیا کا انمول رتن'، 'یہی ہے میرا وطن' اور 'عشقِ دنیا اور حبِ وطن' آزادی کی تڑپ اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں۔

اب پریم چند کے ساتھ افسانہ نگاروں کا پورا قافلہ شریکِ سفر ہو گیا تھا جن میں علی عباس حسینی، اعظم کریوی، سدرشن اور حیات اللہ انصاری کے نام اہم ہیں۔ علی عباس حسینی کا 'ایک ماں کے دو بچے' ہندو مسلم فرقہ وارانہ منافرت کے خلاف ایک یادگار افسانہ ہے۔ سہیل عظیم آبادی کا 'الاؤ'، 'پیٹ کی آگ'، 'دو مزدور' اور 'رام اور راون'، حیات اللہ انصاری کا 'بھرے بازار میں'، 'ڈھائی سیر آٹا' اور 'آخری کوشش' انقلابی حقیقت نگاری کے نمونے ہیں۔ یہ افسانے تحریک آزادی کے عوامل کو سمجھنے میں مدد دینے کے ساتھ ساتھ انسان کے بنیادی مسائل کا عرفان بھی عطا کرتے ہیں۔ البتہ یہاں پریم چند کا ذکر نسبتاً تفصیل سے اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس عہد میں ایک پریم چند ہی ایسے افسانہ نگار تھے جو سیاسی اور سماجی اصلاح پسندی کی جنگ میں براہِ راست شریک تھے، اس لیے اُن کے ناول اور اُن کے افسانے اُس زمانے کی سیاسی اور معاشرتی تصویر کا آئینہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اس دور کے ان کے افسانوں میں سیاسی رنگ اتنا غالب ہے کہ مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں تحریکِ وطنیت کی تاریخ، مورخ کا قلم جب آج سے سو پچاس برس بعد لکھے گا تو اس میں اس تیس پچیس برس کی تاریخ کو لکھنے کے لیے جہاں گاندھی جی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں پڑھنی لازمی ہوں گی، وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔"

1935 میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک شروع ہوئی ہر چند یہ تحریک چند انقلابی نوجوان طلبہ کے حوصلوں کی پیداوار تھی مگر اس کے اثرات بڑے دور رس ثابت ہوئے۔ ترقی پسند ادیبوں نے اپنے پہلے ہی مینی فیسٹو میں واضح طور پر اعلان کیا کہ:

"ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال، ہم اُسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگی۔"

بعد ازاں 1936 میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہوئی جس میں خود پریم چند نے اپنے تاریخی خطبہ صدارت میں فرمایا کہ:

"ہماری کسوٹی پر اب وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہے۔"

اسی کانفرنس کے آخری اجلاس میں مولانا حسرت موہانی کی تقریر بھی بہت اہم تھی۔ انھوں نے اشتراکیت کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

"ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہیے۔ محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی تلقین کرنی چاہیے۔ اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔"

ادبی رویوں میں یہ انقلابی تبدیلیاں ہو رہی تھیں کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے اثرات زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی ظاہر ہونے لگے تھے۔ جنگ کے نتائج نے انسان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ انسانی قدروں کی بساط درہم برہم ہو چکی تھی۔ عالم گیر افراتفری، اخلاقی، روحانی اور تہذیبی قدروں کا زوال، خاندانی زندگی کا انتشار، مشینی عہد کی حشر سامانیاں، سیاسی تضادات، اقتصادی نابرابری اور طبقاتی کش مکش نے انسانی فکر و احساس میں زبردست تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ 1936 سے 1946-47 کے وسط تک اردو افسانہ موضوع اور فن دونوں اعتبار سے پختہ تر ہو چکا تھا۔ پریم چند کا 'کفن'، عباس حسینی کا 'دو شریفوں کا مقابلہ'، اشک کا 'ڈیگن کا چوا'، بیدی کا 'گرم کوٹ'، کرشن چندر کا 'ٹوٹے تارے'، حیات اللہ انصاری کا 'آخری کوشش'، منٹو کا 'جنگ' اور 'نیا قانون'، احمد علی کا 'ہماری گلی' اور غلام عباس کا 'آنندی' جیسے شاہکار افسانے لکھے جا چکے تھے۔ ان افسانوں میں اس عہد کے سیاسی اور سماجی مسائل کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنا ممکن نہیں تاہم ان میں منٹو کا 'نیا قانون' ایک ایسا افسانہ ہے جو خالص موضوعاتی ہوتے ہوئے بھی فنی اعتبار سے اردو کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ افسانے میں 1935 کا ہندوستان اپنے سیاسی پس منظر کے ساتھ سانس لیتا نظر آتا ہے۔ افسانے میں استاد منگو جو اپنی تند مزاجی، جذباتیت اور معصومیت کے ساتھ ہندوستانی عوام کے فکر و احساس کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے۔ پورا افسانہ طنز ملیح کے پیرائے میں لکھا گیا ہے اور ہندوستانی عوام کی سوچ اور مزاج کی بھرپور عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ شاید منٹو اس افسانے کے ذریعے اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہوں کہ صرف 'نیا قانون' بنا لینے سے آزادی جمہوری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اگر اس قانون کے برتنے کا شعور پیدا نہ ہو تو 'نیا قانون' انسان کے لیے بے لگام گھوڑے کی سواری ثابت ہو سکتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے سب سے اہم افسانہ نگار کرشن چندر تھے۔ سماجی حقیقت نگاری، گہرا جمالیاتی احساس، فطرت کی مرقع کاری اور بے پناہ خلوص انسان دوستی اُن کے افسانوں کو زندگی اور توانائی عطا کرتی ہے۔ انھوں نے افسانے نہیں لکھے ہیں بلکہ سماجی کمزوریوں، اقتصادی نابرابری اور سیاسی جبر و استحصال کے خلاف قلمی جہاد کیا ہے۔ ان داتا، دو فرلانگ لمبی سڑک، بھوت، زندگی کے موڑ پر اور مہالکشمی کا پل وغیرہ اُن کے ایسے ہی افسانے ہیں جن میں انقلابی تحریک کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

15 اگست 1947 کو ملک کی آزادی کے ساتھ تقسیم کا تاریخی حادثہ رونما ہوا جس نے برصغیر کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ تقسیم ہند کے بعد جو غیر معمولی واقعات اور حادثات وقوع پذیر ہوئے اس نے پورے ملک میں انتشار و اضطراب کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ تقسیم کے فوراً بعد فسادات کا ایسا بھیانک سلسلہ شروع ہوا کہ سارا نظامِ زندگی درہم برہم ہو گیا۔ اردو میں تقسیم اور فسادات کو موضوع بنا کے بے شمار افسانے لکھے گئے۔ منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ، موذیل، کھول دو اور کرشن چندر کا 'ہم وحشی ہیں'، پشاور ایکسپریس، خواجہ احمد عباس کا 'اجنتا'

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

ناگ پور کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر

سیّد عبدالعلی عادل

محمد اظہر حیات

اٹھارہویں صدی عیسوی میں دلی اور لکھنؤ اردو شعر و ادب کے دو اہم گہوارے تھے۔ اس دور میں میر تقی میر، سودا اور میر حسن جیسے متقدمین شعرا اپنے منفرد لہجے سے پوری اردو شاعری کو متاثر کر رہے تھے یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز سے تقریباً 1875 تک شعرا میں اگلے وقتوں کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ اسی دور میں ناسخ، آتش، ممنون، انیس، دبیر، غالب، مومن اور ذوق ایسے شعرا تھے جو ممتاز حیثیت کے حامل تھے، ٹھیک اسی دور میں اردو مراکز سے دور شعر و ادب کے اعتبار سے بنجر زمین ناگپور میں سید عبدالعلی عادل گیسوئے اردو سنوارنے میں مصروف تھے۔ ان کی شاعری میں بھی وہی رنگ غالب نظر آتا ہے جو متقدمین و متوسطین کا خاصہ تھا۔

عادل ناگپوری 1823 میں ناگپور میں پیدا ہوئے اور یہیں 1894 میں انتقال کیا۔ ان کا پورا نام سید محمد عبدالعلی تھا۔ وہ عادل تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد محمد علی ٹیپو سلطان کی حکومت میں اعلا عہدے پر فائز تھے۔ 1799 میں سلطان کی شہادت کے بعد ریاست میسور میں بھگدڑ مچ گئی، کئی لوگ ملک کے مختلف حصوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، محمد علی نے بھی ہجرت میں عافیت سمجھی اور ناگپور چلے آئے۔ یہاں اس وقت رگھو جی راجا کی حکومت تھی۔ محمد علی راجا کے دربار سے وابستہ ہو گئے، اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد وہ راجا کے مقرب ہو گئے اور ترقی کر کے رسالدار کے عہدے تک پہنچے۔ محمد علی کے تین بیٹے تھے ایک سید محمد حیدر حسن، سید عبدالعلی دوسرے اور تیسرے محمد حسین علی تھے۔ تینوں بیٹوں میں سید محمد عبدالعلی نے خوب نام کمایا۔ وہ اپنے والد کی طرح غیر معمولی ذہین اور باصلاحیت تھے۔ انھیں عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ مقامی زبان گونڈی پر عبور حاصل تھا۔

اس کے علاوہ انھیں قرآن، حدیث، فقہ، منطق، حکمت اور صرف و نحو جیسے علوم پر بھی دسترس حاصل تھی۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی کتاب 'شرح کریما' کا اردو میں ترجمہ عادل نے اس وقت کیا جب ان کی عمر صرف 14 یا 15 سال تھی۔ اس کے بعد پے در پے 16 کتابیں تصنیف و تالیف کیں جس کی تفصیل اس طرح ہے:

1. 'خزائن الاشعار' پہلا مجموعہ کلام جو 1854 میں مرتب کیا گیا، اس میں اردو کے 4 سلام، 2 مثنوی، 3 مرثیے، 2 مناقب، 2 معمے، 9 قطعات، اردو کی اور فارسی کی 3 غزلیں شامل ہیں۔
2. 'نثر الحسین' خطوط کا مجموعہ، یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔
3. 'سحر بابل' تین ہزار چار سو اشعار کی فارسی مثنوی ہے جس کا موضوع تصوف و سلوک ہے۔
4. 'ریاض المآرب' ایک ہزار تین اشعار کی فارسی مثنوی ہے جس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سیرت پر روشنی ڈالی ہے۔
5. 'مجمع المضامین' اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں قطعات تاریخ، غزلیں، سلام، مرثیے، قصیدے، قطعات اور معمے شامل ہیں۔
6. 'فقہ اکبر' 108 صفحات پر مشتمل ہے جس میں اسلامیات کے موضوع پر اردو میں مضامین ہیں۔
7. 'نصاب گونڈی' گونڈی الفاظ کے معنی پر مشتمل ہے، 92 صفحات کی یہ کتاب منظوم لغت ہے۔
8. 'دیوان قصائد' اس دیوان میں فارسی کے 18 اور اردو کے 2 قصیدے شامل ہیں۔
9. 'دیوان عادل' اس میں اردو کی 84 غزلیں ہیں اور ہر غزل میں اوسطاً 40 تا 50 اشعار ہیں۔ علاوہ ازیں ایک حمد، ایک نعت، 8 قطعات، 2 معمے، 2 مثنویاں اور 5 متفرق اشعار شامل ہیں۔
10. 'دیوان فارسی' اس میں غزلیں، قطعات، رباعیات، مثنویات اور معمہ جات وغیرہ حروف تہجی کے اعتبار سے درج ہیں۔
11. 'دیوان تاریخات' اس دیوان میں 190 قطعات تاریخ ہیں جن میں 14 قطعات تاریخ اردو میں اور باقی تمام فارسی میں ہیں۔
12. 'مکتوبات عادل' عادل کے 90 خطوط کا مجموعہ۔
13. 'مفتاح الفتوح' خط کے انداز میں قرآن و حدیث کی روشنی میں روح کی حقیقت واضح کی ہے۔
14. 'حقیقت خواب' 11 صفحے کے اس کتابچے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں خواب کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔
15. 'چہل حدیث مترجم' 40 مختصر اور فکر انگیز احادیث کا منظوم ترجمہ۔
16. 'نور الہدیٰ' فارسی زبان میں منظوم رسالہ 82 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مذہبی نوعیت کی مثنویاں، قصائد اور غزلیں شامل ہیں۔
17. 'شرح علوم' اس مخطوطے میں عادل نے 200 اشعار پر مشتمل اپنے نعتیہ قصیدے کی فارسی میں شرح لکھی ہے۔

مذکورہ بالا تمام تصانیف کا ذکر ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اپنی تصنیف 'ناگپور میں اردو کا ارتقائی سفر' مطبوعہ 1994 میں اور اس کے بعد 'کلیات عادل' مطبوعہ 2006 میں تفصیل سے کیا ہے۔ انھوں نے عادل کو ناگپور کا پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا ہے۔ تمام مخطوطات عادل نے اپنے قلم سے تحریر کیے ہیں جو بے حد خوش خط ہیں۔

عادل کے رنگ سخن کے متعلق ہم نے سطور بالا میں ہی عرض کیا ہے کہ ان کے کلام میں متقدمین و متوسطین کا رنگ غالب نظر آتا ہے یعنی وہی سوز و گداز، رشک و رقابت، امید و ناامیدی، فراق و وصال اور اضطراب و سرور کے مضامین کثرت سے ان کے کلام میں ملتے ہیں جو اس دور میں مروج تھے۔ یہ تمام باتیں محض شاعرانہ روایات کے مطابق ہیں ایسا بھی ہم نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اکثر شعروں میں ان کے ذاتی تجربے اور ذہنی تاثرات کی جھلک بھی ملتی ہے جیسا کہ عادل کہتے ہیں:

خیالِ یار جس دل میں نہیں ہے
وہ گویا اک مکانِ بے مکیں ہے

مذکورہ خوبیوں اور صفات کے حامل یہ متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

دل نے کچھ پہچانا اس کو اس طرح بے باک تھا
شوخ تھا گستاخ تھا عیار تھا سفاک تھا

نظر آیا جمالِ یار جب آئینۂ دل میں
تو منتِ نقش کو ہم مستقل روشن گراں سمجھا

چاند سورج چاند سورج تجلیاں ہیں، بجلیاں
صبح عارض شام گیسو اور وہ چلمن ہے روزِ عید

ہو گیا وصل جو اس سے کسی رات عادل
اس کو بیداری کا عالم سمجھوں یا خواب سمجھوں

عادل کی شاعری سامنے کی گفتگو لگتی ہے۔ صاف ستھرے اور ہلکے پھلکے انداز میں وہ معنی خیز اشعار کہہ جاتے ہیں۔ دیکھیے دنیا میں رنج و غم اور خوشی و مسرت کا ذکر کس شاعرانہ انداز میں کیا ہے:

ہنستا ہے گل تو روتی ہے شبنم تمام رات
خالی غم و طرب سے جہاں کا چمن نہیں

یہ شعر بھی دیکھیے:

شادی و غم سے نہیں مجلس دنیا خالی
جام مے سے ہے بھرا تو کہیں مینا خالی

فطری تغیرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

جوانی ہو گئی رخصت اب آئی پیری ہے
خزاں چمن میں ہے آئی گئے بہار کے دن

عادل من و تو کے جھگڑے میں نہیں پڑتے بلکہ واضح الفاظ میں کہتے ہیں:

محبت عادل ہے یہ میں تو کا جھگڑا
حقیقت ہے وہی اور تو نہیں ہے

اور اس شعر پر بے ساختہ داد نکلتی ہے:

غمزہ و جمال رخ پہ نہ صاحب کبھی کریں
جاتا ہے جیا، دل میں بدل، غم تمام کل

عادل کے کلام میں زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ انھوں نے عشق میں ڈوبے اشعار بھی بڑے سلیقے سے کہے ہیں۔ ان کا محبوب محض گوشت پوست کا انسان نظر آتا ہے:

ہر گام پہ سو فتنۂ محشر ہیں نمودار
پیدا ہوا ہے جو نہال قد طرز چلن سے

دیکھتے ہی جسے دل قربان ہوا
نقشے کے، معنی کے، حرف و نام کے

عادل کی شاعری کا ایک پہلو رومانی شاعری بھی ہے۔ ان کے کلام میں صنفِ نازک کے موضوعات کی بہتات ہے۔ وہ واردات قلب عوامی زبان میں بیان کرتے ہیں، اس لیے وہ عوامی احساسات کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بعض اوقات سطحیت آ گئی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

گفتگو میں لے لیا بوسہ جواب کا، کیا تو
کس قدر بے باک ہے یہ شوخ گستاخانہ بھی

کہہ دیا کو سب نے اگر تختہ باندھا
تو میرے دل نے اسے جو ہم نے تختہ باندھا

گورا گورا رنگ یہ زرد لباس، سرخ ہے
یار ہر برگ گل میں پنہاں یاسمین ہے وہ سمیع

غالب نے کہا تھا:

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

اس معاملے میں عادل، غالب سے ایک ہاتھ آگے معلوم ہوتے ہیں:

بوسے کے جرم کا ہے بدل بوسہ تم بھی تو
کرتے ہو ہم پہ کس لیے چشم نگاہ سرخ

کسی شاعر نے کہا:

اب میں سمجھا ترے رخسار پہ تل کا مطلب
دولت حسن پہ دربان بٹھا رکھا ہے

عادل اس خیال سے یوں انحراف کرتے ہیں:

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

اردو دُنیا

سرکاری اسکولوں کے طلبہ اردو کتابوں سے محروم

سہارنپور (۹ اگست)۔ سال گزشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی سرکاری اسکولوں کے طلبہ اردو کتابوں سے محروم ہیں۔ ایک مہینہ سے زائد ہو گیا کہ طلبہ اردو کے سبق سے محروم ہیں، دیگر مضامین کی کتابیں آ چکی ہیں لیکن اردو نصاب کا رونا ہے۔ اس بابت اتر پردیش ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے ضلع صدر راؤ عبدالستار نے بتایا کہ ایسی شکایات پورے صوبہ میں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسوسی ایشن کے ذمہ داران اس سلسلے میں اطلاعات لے کر لکھنؤ تک اردو نصاب طلبہ کو جلد فراہمی کے لیے کوشاں ہیں تاکہ طلبہ کا اردو کی تعلیم کا نقصان نہ ہو۔
(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

ڈی ایس سی اعلامیہ کی عنقریب اجرائی کا امکان

اساتذہ کی 10 ہزار خالی اسامیوں کی نشان دہی متوقع

حیدرآباد (۱۴ جولائی)۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے بہت جلد 10 ہزار اسامیوں کے تقررات کے سلسلے میں ڈی ایس سی اعلامیہ کی اجرائی کا امکان ہے۔ باوثوق ذرائع نے بتایا کہ اساتذہ کے تبادلے و ریشنلائزیشن کے عمل کی تکمیل کے بعد توقع ہے کہ 10 ہزار خالی اسامیوں کی نشان دہی ہوگی۔ ابھی تک حکومت کو موصولہ اطلاعات کے مطابق ضلع واری سطح پر ایس جی ٹی اور اسکول اسسٹنٹ کے عہدوں کے بشمول تقریباً 10 ہزار اسامیاں خالی ہیں۔ اضلاع سے تعلق رکھنے والے محکمہ تعلیم کے عہدیداروں نے حکومت کو جو رپورٹ روانہ کی ہے، اس کے مطابق اساتذہ کی خالی اسامیوں کی تعداد 7 ہزار ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ عہدیداروں نے اس میں اردو میڈیم اسکولوں کی اسامیوں کو شامل نہیں کیا کیوں کہ بیشتر اردو مدارس میں طلبہ کی کمی کے سبب ان کی برقراری محکمہ کے لیے اہم مسئلہ بنی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ محکمہ تعلیم کو اردو اساتذہ کی تقرری سے عدم دلچسپی رکھنے والے عہدیداروں نے حقیقی رپورٹ روانہ کرنے سے احتراز کیا جس کے نتیجے میں دیگر میڈیمس کے اساتذہ کی خالی اسامیوں کو شمار کیا جا رہا ہے۔ تلنگانہ حکومت نے کے جی تا پی جی مفت تعلیم فراہم کرنے کی اسکیم کا اعلان کیا ہے جس پر آئندہ سال سے عمل آوری کا منصوبہ ہے، تاہم اساتذہ کی کمی اس اسکیم پر عمل آوری میں اہم رکاوٹ ثابت ہوگی۔ حکومت نے محکمہ تعلیم کو ہدایت دی کہ وہ اسامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ان پر تقررات کے لیے جلد سے جلد ڈی ایس سی اعلامیہ کی اجرائی کو یقینی بنائے تاکہ ٹیچر اور طلبہ کے تناسب کو بہتر بنایا جا سکے۔ حکومت ہر اسمبلی حلقے میں کم از کم ایک ایسا اسکول قائم کرنا چاہتی ہے جہاں کے جی تا پی جی مفت تعلیم کی اسکیم پر عمل آوری کی جا سکے۔
(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو میڈیم اساتذہ کی تقرری کا مطالبہ

کلواکرتی، آندھرا پردیش (۹ اگست)۔ کلواکرتی اردو ہائی اسکول میں اساتذہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے طلبہ کا تعلیمی نقصان ہو رہا ہے جس کے لیے ایم ایل اے کو ایک میمورنڈم حوالے کرتے ہوئے اس جانب خصوصی توجہ دینے اور اعلا عہدیداروں سے بات کرتے ہوئے جلد سے جلد اساتذہ کا تقرر کرنے کا مطالبہ کیا گیا جس پر ایم ایل اے نے اساتذہ کی تقرری کروانے کا وعدہ کیا۔ اس موقع پر محمد خلیل مولوی، عبدالماجد، سید قدیر، محمد خلیل اور محمد سلمان وغیرہ موجود تھے۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

پرانی دہلی کے 6 اردو میڈیم اسکولوں کی دوسری شفٹ ختم

دوسری شفٹ میں طلبہ کی تعداد کم ہونے اور مالی بحران کا بہانا بنا کر شمالی دہلی میونسپل کارپوریشن نے کارروائی کی
دونوں شفٹوں کو ضم کیے جانے پر کونسلروں اور اردو داں طبقے نے سخت مخالفت کی

نمبر شمار	جن اسکولوں کو ضم کیا گیا ان کے نام	اسکول کا نیا نام
۱	ایم سی پرائمری اسکول، لال کنواں نمبر 1 اور 2	ایم سی پرائمری کوایڈ اسکول لال کنواں
۲	ایم سی پرائمری اسکول، منیا محل ا، ۱ و ۲	ایم سی پرائمری کوایڈ اسکول منیا محل
۳	ایم سی پرائمری اسکول، حویلی اعظم خاں نمبر 1 اور 2	ایم سی پرائمری کوایڈ اسکول حویلی اعظم خاں
۴	ایم سی پرائمری اسکول، گلی [illegible] خاں نمبر 1 اور 2	ایم سی پرائمری کوایڈ اسکول گلی [illegible] خاں
۵	ایم سی پرائمری اسکول، جامع مسجد [illegible]	ایم سی پرائمری کوایڈ اسکول، جامع مسجد
۶	ایم سی پرائمری اسکول، دریا گنج اور سنہری مسجد [illegible]	ایم سی پرائمری اسکول، [illegible]

نئی دہلی (۷ اگست)۔ شمالی دہلی کارپوریشن نے پرانی دہلی کے 6 اردو میڈیم اسکولوں کی دوسری شفٹ ختم کرکے ایک شفٹ کر دیا اور اسکول کے ناموں میں بھی تبدیلی کی گئی ہے۔ اس کی دو وجہ بتائی گئی ہیں، ایک کارپوریشن نے مالی بحران کے پیش نظر یہ قدم اٹھایا، دوسری: دوسری شفٹ میں طلبہ کی تعداد کم ہونے کے سبب اسے صبح کی شفٹ میں ضم کر دیا ہے۔ کارپوریشن کے اس قدم کی سخت مخالفت کی جا رہی ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ شمالی دہلی کارپوریشن کے اسکولوں میں طلبہ کی تعداد بہت ہی کم ہو گئی ہے۔ پوری کارپوریشن میں طلبہ کی تعداد 8000 کم ہو گئی ہے جس میں سٹی زون کے اسکولوں میں 2000 بچے کم ہوئے۔ نوبت یہ آ گئی کہ کونسلر اب کارپوریشن کے اسکولوں کو پرائیویٹ اسکولوں یا دہلی حکومت کو دینے کی وکالت کر رہے ہیں۔

شمالی دہلی کارپوریشن نے گزشتہ 16 جون کو پرانی دہلی کے 6 اردو میڈیم اسکولوں کی دوسری شفٹ بند کرنے کی تجویز منظور کی تھی۔ بتایا جا رہا ہے کہ کارپوریشن نے یہ قدم دوسری شفٹ میں طلبہ کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے اٹھایا، جب کہ کہا یہ بھی جا رہا ہے کہ کارپوریشن ان دنوں مالی بحران سے دوچار ہے، اس لیے اس نے پیسہ بچانے کے لیے یہ تجویز منظور کی ہے۔ ان اسکولوں کے انضمام سے اردو اساتذہ کی تعداد جو پہلے ہی کم ہے مزید کم ہو جائے گی کیوں کہ دوسری شفٹ میں پڑھانے والے اساتذہ کہاں جائیں گے۔ ساتھ ہی کلاسوں میں بیٹھنے کا انتظام ہوتا ہے اب جب شام کے طلبہ بھی کلاس میں آ جائیں گے تو ان کے بیٹھنے کا انتظام کیسے ہوگا۔ شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ کارپوریشن نے اردو کو ختم کرنے کی غرض سے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اگر اسکولوں میں طلبہ کی تعداد کم ہو رہی ہے تو اس کی ذمہ داری بھی تو خود کارپوریشن کی ہے۔ قابل ذکر یہ بھی ہے کہ کارپوریشن نے گزشتہ ماہ تقریباً 2000 کانٹریکٹ ٹیچروں کا معاہدہ بھی ختم کر دیا ہے۔ کارپوریشن کے اس فیصلے کی کونسلر سمیت اردو داں طبقے نے بھی سخت مخالفت کی ہے۔ کونسلر آل محمد اقبال کا کہنا ہے کہ کارپوریشن اردو میڈیم اسکولوں کو کمزور کرنے کی سازش کر رہی ہے لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ضرورت پڑی تو اس کے خلاف تحریک بھی چلائی جائے گی نیز اردو ٹیچروں کی تقرری کے لیے بھی جدوجہد کی جائے گی۔ سماجی کارکن ڈاکٹر صغیر اختر کا کہنا ہے کہ کارپوریشن نے صرف اردو میڈیم اسکولوں کو ہی کیوں ضم کیا ہے۔ کارپوریشن کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ مائنارٹیز ویلفیئر فاؤنڈیشن کے چیئرمین فرید احمد نے کہا کہ کارپوریشن کو اپنی پالیسی سے ان اسکولوں کو مستثنیٰ رکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس سلسلے میں کونسلر آل محمد اقبال، کونسلر سیما طاہرہ، کونسلر خرم اقبال سے بات کی ہے، ساتھ ہی کارپوریشن کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر سے بھی بات چیت کی گئی جنھوں نے بتایا کہ دوسری شفٹ میں طلبہ کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔ کونسلر راکیش کمار نے بتایا کہ یہ بات تشویش ناک ہے کہ کارپوریشن کے اسکولوں سے طلبہ کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے، اس لیے میں نے تجویز دی کہ ان اسکولوں کو یا تو دہلی حکومت کے ماتحت کرنا چاہیے یا معاہدہ کے تحت پرائیویٹ اسکول کے سپرد کر دینا چاہیے یا پھر کسی تعلیمی این جی او کے حوالے کر دینا چاہیے۔
(انقلاب۔ دہلی)

حیدرآباد کرناٹک میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ

گلبرگہ، کرناٹک (5 اگست)۔ ساجد علی رنجولوی نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ علاقہ حیدرآباد کرناٹک میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا چاہیے کیوں کہ اس علاقے میں اردو داں عوام کا تناسب 45 فیصد سے زیادہ ہے۔ محمد ساجد علی نے کہا کہ سابق ریاستی وزیر اعلا دھرم سنگھ کے دور اقتدار سے وزیر اعلا سدارامیا تک اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے مسئلے کو مسلسل نظر انداز کیا گیا۔ وزیر اعلا سدارامیا سیکولر ذہنیت کی حامل شخصیت ہے، اس لیے انھیں چاہیے کہ ریاست میں علاقہ حیدرآباد کرناٹک واحد ایسا علاقہ ہے جہاں 45 فیصد سے زیادہ عوام اردو زبان کا استعمال کرتے ہیں، اس لیے کم از کم اس علاقے میں سرکاری کام کاج اردو زبان کے ساتھ کرنے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیب کا نام ہے، علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے اردو داں طبقے کو اپنی زبان اور تہذیب کو بچائے رکھنے کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔
(اردو ایکشن۔ بھوپال)

اردو میں سائن بورڈ آویزاں کرنے کی اپیل

بیدر، کرناٹک (23 جولائی)۔ مشہور سماجی کارکن اور خادم اردو جناب محمد علیم الدین القاضی نے ایک پریس نوٹ جاری کر کے تمام دکانداروں سے دردمندانہ اپیل کی ہے کہ وہ اپنی اپنی دکانوں کے سائن بورڈ پر اردو میں دکانوں کے نام آویزاں کریں۔ انھوں نے کہا کہ بیدر اردو علاقہ ہے، یہاں کا بچہ بچہ اردو بولتا ہے۔ اگر سائن بورڈ پر اردو میں دکان کا نام لکھا جائے گا تو اس سے کاروبار میں جہاں ترقی ہوگی وہیں اردو جیسی شیریں ہندستانی زبان کا تحفظ بھی ہوگا۔
(سالار۔ بنگلور)

پونے: ضلع پریشد کے چار اردو اسکول دو سال سے نئی تقرریوں کے منتظر

پونے (29 جولائی)۔ ایک جانب جہاں ریاستی حکومت حق تعلیم کے تحت طلبہ کو اسکول سے جوڑنے کے لیے 'ڈراپ آؤٹ سروے' اور دیگر بیداری مہم چلا رہی ہے وہیں دوسری طرف اس کے متعلقہ انتظامیہ کی مبینہ تساہلی کے سبب پونے ضلع پریشد کے چار اردو پرائمری اسکول دو سال کے زائد عرصے سے اساتذہ کی نئی تقرریوں کو ترس رہے ہیں۔ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ ان اسکولوں میں طلبہ کی تعداد کی بہ نسبت ٹیچروں کی تعداد ناکافی ہے۔ نتیجتاً ایک ٹیچر کو ہی کئی جماعتیں سنبھالنی پڑ رہی ہیں اور طلبہ اسکول پہنچنے کے باوجود بڑی مشکل سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

ذرائع کے مطابق پونے ضلع کے جنّر تعلقے کے چار ضلع پریشد اسکولوں میں فی الوقت طلبہ کی تعداد کو مد نظر رکھا جائے تو کم از کم 10 ٹیچروں کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں پونے کی ایک تعلیمی و سماجی تنظیم اور مقامی ایم ایل اے کی جانب سے مکتوبات ارسال کیے گئے ہیں مگر اب تک انھیں صرف زبانی وعدے سے ہی بہلایا جا رہا ہے۔

معاملہ کیا ہے؟ اس ضمن میں جنّر تعلقے کے سماجی خدمت گار عرفان محمد غوث شیخ (بابل بھائی) نے بتایا کہ آلے پھاٹے کی ضلع پریشد پرائمری اور پرائمری اردو اسکول میں 84 طلبہ زیر تعلیم ہیں مگر یہاں صرف ایک خاتون ٹیچر ہی درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہی ہیں، حالاں کہ یہاں مزید چار ٹیچروں کی ضرورت ہے۔

بابل بھائی نے جنّر تعلقے کے دیگر تین اسکولوں کے متعلق بتایا کہ اوتور ضلع پریشد اردو اسکول میں پہلی سے چوتھی جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے اور یہاں 47 بچے زیر تعلیم ہیں۔ اس اسکول میں دو ٹیچروں کی مزید ضرورت ہے۔ بیلہا ضلع پریشد اردو اسکول (پہلی تا پانچویں) میں 58 بچے زیر تعلیم ہیں اور یہاں ایک ٹیچر کی ضرورت ہے۔ یہی حال نارائن گاؤں کے ضلع پریشد اردو اسکول (پہلی تا ساتویں) کا بھی ہے جہاں 70 سے زائد طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں مگر یہاں بھی ایک ٹیچر ہی درس و تدریس پر مامور ہے جب کہ مزید دو ٹیچروں کی ضرورت ہے۔

آلے پھاٹے ضلع پریشد اردو اسکول کے متعلق بابل بھائی نے بتایا کہ ضلع پریشد کی جانب سے ٹیچروں کی تقرری نہ کیے جانے سے طلبہ کا نقصان ہو رہا تھا اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلقے کی ایک سماجی تنظیم 'قادری قلندری گروپ' نے اپنی جانب سے چار ٹیچروں کو یہاں درس و تدریس کے لیے رکھا ہے۔ ان ٹیچروں کو متذکرہ گروپ اپنی جانب سے مشاہرہ ادا کرتا ہے۔

ایک ٹیچر نے بتایا کہ ان کے اسکول میں وہ واحد معلم ہیں جس کے سبب جہاں انھیں کئی جماعتیں سنبھالنی پڑ رہی ہیں وہیں دفتری کام بھی انھیں کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں، زیادہ فکر طلبہ کو ان کا 'حق' دینے کی ہے اسی لیے ساری دقتوں کے باوجود میں کئی کلاسوں کو پڑھا رہا ہوں۔

ذرائع کے مطابق ضلع پریشد کے ماتحت جاری ایسے اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر کی علاحدہ پوسٹ مختص کی جاتی ہے جہاں 150 سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہوں۔ چوں کہ متذکرہ اسکولوں میں طلبہ کی تعداد کم ہے تو ہیڈ ماسٹر کا کام بھی وہاں کے ٹیچر کو ہی دیکھنا پڑتا ہے۔

متذکرہ چاروں گاؤں کے اسکولوں میں ٹیچروں کی تقرری نہ کیے جانے پر بابل بھائی اور دیگر لوگوں نے الزام لگایا کہ پونے ضلع پریشد کی تساہلی کے سبب تقرری میں تاخیر ہو رہی ہے۔ بابل بھائی نے انقلاب سے بات چیت میں کہا کہ ہم نے پونے کی ایک این جی او 'تنظیم والدین' جو ضلع بھر میں تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں ہے، کی معرفت متعدد بار مطالباتی مکتوب ضلع پریشد کو سونپے مگر ہم سے ہر بار یہ وعدہ کیا جاتا ہے کہ "پروسیس چل رہا ہے، جلد ہی ٹیچروں کی تقرری ہو جائے گی"۔ یہ جملہ سن سن کر دو سال کا وقت گزر گیا مگر اب تک متذکرہ اسکولوں میں ٹیچروں کا تقرر نہیں کیا گیا ہے۔ تنظیم والدین کے نائب صدر جناب اکبر سے بات چیت کی گئی تو انھوں نے کہا کہ یہ نہایت افسوس ناک بات ہے کہ ضلع پریشد کے اردو اسکولوں کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا جا رہا ہے۔ ہماری تنظیم نے بارہا ٹیچروں کی تقرری کے لیے مطالبہ کیا مگر پونے ضلع پریشد کی جانب سے صرف تیقن اور وعدہ ہی ملا ہے۔

پونے ضلع پریشد کے دفتر سے 'انقلاب' نے رابطہ کیا تو آفیسر مشتاق شیخ نے کہا کہ متذکرہ چاروں اسکولوں میں ٹیچروں کی تقرری جلد ہی ہو جائے گی۔ جب ان سے استفسار کیا گیا کہ یہ یقین دہانی تو گزشتہ دو سال سے کی جا رہی ہے تو انھوں نے 'پروسیس' کا حوالہ دے کر کہا کہ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن (پرائمری) کی جانب سے تقرری کیے جانے والے ٹیچروں کی لسٹ آگئی ہے اب 'روسٹر' (ایس سی، ایس ٹی اور اوپن کیٹیگری کے لحاظ سے تقرر) کے مطابق ان میں سے ٹیچروں کا انتخاب کرکے انھیں متذکرہ اسکولوں میں مامور کیا جائے گا۔ مشتاق شیخ نے یہ بھی بتایا کہ اردو کے ساتھ ساتھ مراٹھی میڈیم کے ضلع پریشد اسکولوں میں بھی ٹیچروں کی ضرورت ہے جسے سسٹم کے مطابق جلد ہی پُر کیا جائے گا۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

اب پاکستان میں سرکاری خط و کتابت اردو میں شروع

اسلام آباد (6 اگست)۔ وفاقی حکومت نے سپریم کورٹ کے حکم پر اردو کو ملک کی سرکاری زبان بنانے پر عمل شروع کر دیا ہے۔ ذرائع کے مطابق وزیر اعظم ہاؤس نے جسٹس جواد ایس خواجہ کو 17 اگست سے سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کرنے سے متعلق ایوان صدر کو اردو میں ایک سمری بھجوائی۔ ایوان صدر نے بتایا کہ انھوں نے وزیر اعظم ہاؤس سے اردو زبان میں پہلی سرکاری دستاویز موصول کی۔ حکومت نے 10 جولائی 2015 کو سپریم کورٹ کو آگاہ کیا تھا کہ انگریزی کی جگہ اردو کو مرحلہ وار ملک کی سرکاری زبان بنانے کا ایگزیکٹو آرڈر جاری کیا جا چکا ہے۔ حکومت پہلے ہی مختلف محکموں کے سربراہان کو وفاقی کابینہ کی جانب سے سرکاری دستاویزات اردو میں لکھنے کے حکم سے متعلق آگاہ کر چکی ہے۔ 14 مئی کو جاری ہونے والے ایک سرکاری مراسلے میں اردو کو سرکاری زبان بنانے سے متعلق محکموں کے سربراہان سے تجاویز مانگی گئی تھیں۔ دوسری جانب محکمے حکومتی آرڈر پر عمل درآمد کے حوالے سے شش و پنج میں مبتلا ہیں کیوں کہ وہ مستقبل میں اردو کو سرکاری زبان بنانے میں مسائل دیکھ رہے ہیں۔ حکومت نے محکموں کو دستاویزات، فارم اور یوٹیلٹی بل انگریزی سے اردو میں بدلنے کے لیے تین مہینے کا وقت دیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

مشتاق احمد نوری بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری مقرر

پٹنہ (6 اگست)۔ مشہور افسانہ نگار اور حکومت بہار کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ کے سابق افسر مشتاق احمد نوری کو بہار اردو اکیڈمی کا سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔ اکیڈمی کے ذرائع کے مطابق ریاستی اسمبلی انتخابات سے قبل بہار اردو اکیڈمی کی تشکیل نو کرتے ہوئے حکومت بہار نے مشتاق احمد نوری کو سکریٹری، پروفیسر اعجاز علی ارشد اور سلطان اختر کو وائس چیئرمین مقرر کیا ہے۔ بہار اردو اکیڈمی کے ارکان میں ڈاکٹر سید احمد قادری، پروفیسر علیم اللہ حالی اور زرنگار یاسمین کے نام شامل ہیں۔ کافی دنوں سے بہار اردو اکیڈمی میں سکریٹری کی جگہ خالی تھی اور امتیاز کریمی اضافی ذمہ داری سنبھال رہے تھے۔ وہ اردو ڈائرکٹوریٹ میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ مشتاق احمد نوری بہار کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ ان کی پیدائش 7 مئی 1950 کو کوکی پوتھیہ (فاربس گنج، ارریہ) میں ہوئی۔ بی ایس سی، بی ایڈ، ایم اے کرنے کے بعد حکومت بہار کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ سے وابستہ ہو گئے۔ ابتدا میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھتے رہے اور شاعری کا ذوق بھی رہا، لیکن بعد میں افسانہ نگاری کو اپنایا۔

(آئی۔ تعمیر)

اردو کی حالت زار پر اظہار افسوس

علی گڑھ (5 اگست)۔ ٹیچرس ایسوسی ایشن علی گڑھ کے عہدیداران کے جلسے میں ایسوسی ایشن کے صوبائی جنرل سکریٹری علی حیدر رضوی کا استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر مولانا آزاد نگر میں منعقد جلسے میں علی گڑھ میں اردو کی صورت حال اور اردو اساتذہ کے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ علی حیدر رضوی نے خطاب کرتے ہوئے ساتھیوں کی جانب سے چلائی جا رہی تنظیمی سرگرمیوں پر اظہار اطمینان کے ساتھ ساتھ ضلعی سطح پر اردو کے ساتھ افسران کے سوتیلے رویے پر تشویش کا اظہار کیا۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

نئی دہلی۔ اردو کے معروف استاد شاعر نصرت گوالیاری کا 28 جولائی 2015 کو حرکت قلب بند ہو جانے سے چتلا گیٹ، واقع ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہو گیا۔ وہ 73 برس کے تھے اور کافی عرصے سے علیل تھے۔ بعد نماز عشاء ان کی نماز جنازہ نئی نماز مسجد فیض الٰہی میں ادا کی گئی جب کہ تدفین قبرستان مہندیان میں عمل میں آئی جس میں بڑی تعداد میں دہلی کی ادبی شخصیات نے شرکت کی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں ان کی اہلیہ کے علاوہ چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ان کے مرحوم بھائی کے ہیں جن کی پرورش خود نصرت گوالیاری نے کی ہے۔ نصرت گوالیاری کی پیدائش 1942 میں گوالیار میں ان کے ننھیال میں ہوئی تھی۔ ان کے آبا و اجداد کا تعلق دہلی سے ہے۔ ان کا خاندان مہرولی میں رہائش پذیر تھا جو دور شاہجہانی میں فصیل بند شہر میں منتقل ہو گیا تھا اور آج بھی کوچہ رحمان میں مقیم ہے۔ نصرت گوالیاری 13 سال کی عمر میں 1955 میں دہلی آ گئے اور ہمیشہ کے لیے دہلی کے ہی ہو کر رہ گئے لیکن اپنے تخلص کے ساتھ گوالیاری کو برقرار رکھا۔ نصرت گوالیاری کو شاعری کا بچپن سے ہی شوق تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنا کلام شمیم فرحت اور جمال نثار اختر کو دکھایا لیکن بعد میں برصغیر کے معروف شاعر حضرت احسان دانش کے اسکول میں داخل ہو گئے اور عشرت کرتپوری کی شاگردی اختیار کر لی۔ 'سائبان' اور 'سب خواب' کے نام سے ان کے دو شعری مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انھیں ان کی شعری خدمات کے لیے دہلی اردو اکادمی کی جانب سے ایوارڈ برائے اردو شاعری بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ نصرت گوالیاری موجودہ وقت میں دہلی کے ایسے واحد شاعر تھے جن کے سب سے زیادہ شاگرد تھے۔ ان میں معروف شاعر انور باری مرحوم، دیوان روشن لعل روشن، نظر ایوبی، سالکین تیغی مرحوم، حبیب عاصم، حنا تیموری، عارف تبسم اور اقبال فردوسی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : زر بکف (شعری مجموعہ)
شاعر : علامہ عارف ایوبی بدایونی
مرتب : پروفیسر منظر ایوبی
ضخامت : 270 صفحات
قیمت : 300 روپے
ملنے کا پتا : دفتر ہماری آواز محلہ بیداں نوله شکیل روڈ، بدایوں (یوپی)
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا اشرفی
razakidak@gmail.com

زیر نظر کتاب 'زر بکف' معروف بزرگ شاعر علامہ عارف ایوبی بدایونی کا شعری مجموعہ ہے جو بک ریڈرز کلب دبستان بدایوں پاکستان سے پروفیسر منظر ایوبی کی نگرانی میں انجینئر حاجی محمد شعیب مکی کی کوششوں سے منظر عام پر آیا ہے جس میں حرف چند کے عنوان سے علامہ کیفی چریاکوٹی کے منظوم تاثرات کے علاوہ جناب رشی بدایونی کے تاثرات پر مشتمل مضمون شامل ہیں۔ پروفیسر منظر ایوبی کے تاثرات اور تسلیم غوری بدایونی کے تاثرات کے ساتھ ساتھ خود نوشت کے عنوان سے علامہ عارف ایوبی کا ابتدائیہ بھی شامل ہے جو انھوں نے جنوری 1988 میں لکھا تھا، اس کے علاوہ 161 غزلوں کو شامل کیا گیا ہے۔ عارف ایوبی کی غزلوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ کی آمیزش ہے، ان کی غزلوں میں درد دل بھی ہے درد جہاں بھی ہے عشق غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی، ان کی غزلوں میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کا ذکر بھی موجود ہے جس میں عارفانہ رنگ ہے۔ غزلوں کا انداز منفرد ہے، لب و لہجہ سنجیدہ ہے اور فکر انگیز اشعار سے 'زر بکف' لبریز ہے۔ ملاحظہ ہوں چند منتخب اشعار:

کیا کرے لطف جام جم لے کر
شادماں ہو جو تیرا غم لے کر

آپ کے غم میں مرنے والوں کی
موت میں بھی حیات ہوتی ہے

وقت سے ... سے ... تک پہنچے
... تک پہنچے

جتنا ... ہم نشیں
... سمٹتے چلے گئے

جب تک شہ ہو گا عدل و مساوات کا کرم
اٹھتے رہیں گے یوں ہی فسادات بیش و کم

ناقد کی نگاہیں بھی مائل بہ کدورت ہیں
تنقید کے پردے میں تنقیص جھلکتی ہے

عارف ایوبی کی غزلوں میں عارفانہ کلام کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی سے بھی شکوہ جا بجا ملتا ہے۔ زمانے کے پیچ و خم سے وہ بہ خوبی واقف ہیں اور دنیا کی حقیقتوں کو نہ صرف وہ محسوس کرتے ہیں بلکہ اشعار کے ذریعے وہ اپنے خیالات کا بڑی سنجیدگی اور فکر انگیز و پر اثر انداز میں اظہار بھی کرتے ہیں، مثلاً:

اس سے پہلے نہ سنی اور نہ دیکھی عارف
جیسی اس دور میں دنیا کی تباہی دیکھی

آج سب ہی دشمن ہیں خواہش ہوں کہ بچ نے
آدمی زمانے میں کس طرح سکوں پائے

کشتی ارماں کی کشتیاں یارو
بہہ گئیں زندگی کے دھاروں میں

ہر گام پہ کھاتی ہے جو چال ہوس کے
خواہش بھی انسان کو مرنے نہیں دیتی

دور حاضر کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ
فکر مطرب نے تو فنکار نے فن بدلا ہے

'زر بکف' کے مطالعے سے علامہ عارف ایوبی بدایونی کی غزلوں کی مختلف جہات سے روبرو ہونے کا موقع ملا، امید کہ قاری اسے پڑھ کر محظوظ ہوں گے۔ کتاب اپنے باطنی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے۔ سرورق رنگین اور دیدہ زیب ہے، قدردین و تحقیق کاری سے 'زر بکف' لبریز ہے۔

★★★

نام کتاب : بیان قلم
شاعر : مختار عاشق جونپوری
مرتب : سلمان جونپوری
ضخامت : 232 صفحات
قیمت : 250 روپے
ملنے کا پتا : 23- اقرا کمپلیکس، نزد سعد کی دھابی، نارول، احمد آباد، گجرات
تبصرہ نگار : سعید اختر اعظمی
sakhtar0075@gmail.com

رب کریم کا ہر کمال اور اک سے بالاتر ہے جسے عقل سلیم بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح جب شوق زاد طیبہ ہو تو چشم اشک فشاں اور یہ بے پانی چھالوں کی سوغات لاتی ہے۔ حمد و نعت کے یہ مراحل جذبوں کی پذیرائی سے عبارت ہیں۔ مختار عاشق جونپوری نے مدحت کا زینہ بہ زینہ سفر طے کرتے ہوئے منقبت کے گیسو بھی سنوارے ہیں۔ انھوں نے غزلوں کے پیرایے میں تیرگی شام کی داستان بھی سنائی ہے تو کسی کے غم کا احترام بھی کیا ہے۔ ان کا یہ شعری سرمایہ نصف صدی کو محیط ہے جس میں زندگی کے متنوع رنگوں کی بہار نظر آتی ہے۔

'گلشن اسلام' (نعت و منقبت، 1968)، 'انداز بیاں اور' (نعت و غزل، 2007) کے بعد حالیہ مجموعہ 'بیان قلم' نعت و منقبت، قصائد، قطعات، رباعیات اور غزلوں پر مشتمل ہے جسے ان کے نبیرہ سلمان جونپوری نے ترتیب دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میری نظر ہے اور خدا کا جمال ہے
حب رسول پاک یہ تیرا کمال ہے

صدیق ساتھ ساتھ تو بستر پہ مرتضیٰ
شرمندہ کفر دیدۂ حیراں لیے ہوئے

دعا قبول ہوئی سرور دو عالم کی
عمر کا جو بھی قدم ہے خدا کی راہ میں ہے

کیا کہیں زلف سنواری تھی کسی نے ہمدم
رات گردوں پہ مجھے ایک بھی تارا نہ ملا

درد دل، درد جگر، درد جدائی توبہ
ضبط کرتا ہوں مگر اشک نکل جاتے ہیں

بادل کو دیکھ کر تو گھڑا توڑتا ہے کیوں
بادل برسنے کیا تیرے گھر پہ بھی آئے گا

خیالات کی یہ روانی خوب ہے لیکن جہاں بے ترتیبی نے راہ پائی ہے وہاں منقبت کے اشعار نعت میں اور نبی کی ذات گرامی کے شانہ بہ شانہ محبوب سے ہجر و فراق کا ذکر بھی دانستہ نادانستہ ہو گیا ہے۔

نعت گوئی میں مختار تجھ سا انجمن میں سخنور نہیں ہے کا دعویٰ کرنے والے مختار عاشق جونپوری نے احمد اور احمد کا پردہ تو برقرار رکھا ہے مگر حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حمزہؓ، خالدؓ سیف اللہ، سعد بن ابی وقاصؓ، عبیدہؓ بن جراحؓ، ابوایوبؓ انصاری، ابوذرؓ غفاری، سلمان فارسیؓ، حسان بن ثابتؓ، بلالؓ، امام حسینؓ اور عباسؓ کی منقبت نعت کی روانی میں کر گئے ہیں۔ قرطاس پر دل شاعر کا لہو بہا کے شعر لکھنے کی روایت کی پاسداری کرنے والے مختار عاشق نے اس جانب توجہ دی ہوتی تو یہ ان کے حق میں فال نیک ہی ہوتا۔ عقیل انصاری، انیس ایم عباس، عارف برقی، عقیل شاطر انصاری، وفا جونپوری مرحوم، محمد عرفان جونپوری اور مرتب سلمان جونپوری کی آرائیں اور فن کار کا بھرپور احاطہ کرتی ہیں۔

★★★

نام کتاب : اشتیاق سعید کی فنی جہات
مرتب : عبدالباری ایم. کے
ضخامت : 200 صفحات
قیمت : 250 روپے
ملنے کا پتا : 702 بلو ویسٹ، پلاٹ نمبر 74، سیکٹر 9، نئی پانویل نوی ممبئی-410206
تبصرہ نگار : ام ماریہ حق
ummemariahaque@gmail.com

زیر تبصرہ کتاب 'اشتیاق سعید کی فنی جہات' کے مرتب عبدالباری ایم. کے ہیں۔ اس کتاب کا انتساب انھوں نے اکیسویں صدی کے نام کیا ہے۔ کتاب میں 16 مشاہیر ادب کے مضامین شامل ہیں، سبھی مضامین قابل تعریف اور معلوماتی ہیں۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے مضمون 'پریم چند کی دیہی روایت کا پاسدار اور امین: اشتیاق سعید' میں تحریر کیا ہے کہ اشتیاق سعید نے دیہی افسانے کی روایت میں پریم چند کی تقلید تو کی ہے لیکن انھوں نے گاؤں کے جدید مسائل خاص کر ایسے مسائل جن کا تعلق موجودہ عہد سے ہے، کو موضوع بنایا ہے۔ وہیں عبرت مچھلی شہری نے "گاؤں کی مٹی کا افسانہ نگار: اشتیاق سعید" میں اپنی رائے کچھ یوں پیش کی ہے کہ "جن افسانوں میں ان کے کردار گاؤں کے روزمرہ کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں تو ان کے جملے اتنے برجستہ اور فطری ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھتا ہے"۔

کتاب میں ڈاکٹر خورشید نعمانی، رفیق جعفر، مقصود حمید کے مضامین بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ 'اشتیاق سعید کی افسانہ نگاری' پر گفتگو کرتے ہوئے نور الحسنین نے لکھا ہے کہ اشتیاق سعید ماجرہ سازی کے ہنر سے خوب واقف ہیں، مکالمہ بھی لکھتے ہیں منظر کشی کا فن بھی انھیں آتا ہے بس کہیں کہیں زبان پر ان کی گرفت کمزور ہو جاتی ہے اور محاورہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ وہیں محمد بشیر مالیر کوٹلوی کا خیال ہے کہ اشتیاق سعید کی کہانیوں میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی سچائیاں جھانکتی نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر عشرت بیتاب، ڈاکٹر ایم. اے حق، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اور انیس عارفی کے مضامین بھی اشتیاق سعید کی فنی خوبیوں کی نشان دہی کرتے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے مضمون 'اشتیاق سعید اور ہل جوتا' میں لکھا ہے کہ اشتیاق سعید صرف قصہ گو نہیں بلکہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں اپنے منفرد اسلوب کے ثبوت بھی دیے ہیں۔ وہیں م. ناگ فرماتے ہیں کہ اشتیاق سعید کی کہانیاں بیانیہ اظہار میں کہیں دل کو گدگداتی ہیں تو کہیں کلیجے میں تیر کی طرح کھب جاتی ہیں۔ کتاب میں سلیم انصاری اور معراج احمد معراج کے مضامین بھی قابل تعریف ہیں۔

مضامین کے بعد عبدالباری نے 'اشتیاق سعید سے مکالمہ' کے عنوان سے ایک طویل انٹرویو بھی پیش کیا ہے جس میں انھوں نے اشتیاق سعید کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کے آخر میں مرتب نے اشتیاق سعید کے چار مشہور افسانوں پر تجزیے بھی شامل کیے ہیں۔ جن ادبا نے تجزیے پیش کیے ہیں ان میں رؤف صادق، جاوید ندیم، انیس ایم عباس اور ڈاکٹر عظیم راہی شامل ہیں۔ رؤف صادق اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اشتیاق سعید نے 'ہل جوتا' میں دبے کچلے طبقے کی بے بسی، مظلومیت، مغلوبیت کے احساسات کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس افسانے میں منظر نگاری کے علاوہ مکالمے بھی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ وہیں 'بعید از قیاس' کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عظیم راہی رقم طراز ہیں کہ افسانہ 'بعید از قیاس' ہمارے آج کی معاشرتی زندگی کی انتہا کو سامنے لاتا ہے کہ رشتوں کا تقدس اس قدر بھی پامال ہو سکتا ہے کہ آنکھیں خیرہ ہونے کے ساتھ شرم سے جھک جاتی ہیں۔

کتاب 'اشتیاق سعید کی فنی جہات' عبدالباری ایم. کے کی عمدہ کاوش ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادبی دنیا میں اس کی پذیرائی ہوگی اور اشتیاق سعید کے افسانوں پر گفتگو کے نئے در کھلیں گے۔

★★★

بقیہ: تحریکِ آزادی اور اردو افسانہ

صفحہ ۲ سے آگے

بیدی کا 'لاجونتی'، عصمت چغتائی کا 'جڑیں' اور حیات اللہ انصاری کا 'شکر گزار آنکھیں' فسادات کے موضوع پر لکھے ہوئے وہ شاہکار افسانے ہیں جو موضوعی اور ہنگامی ہونے کے باوجود اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہاں ان افسانوں کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تحریکِ آزادی ہمارے لیے کتنی ہی ولولہ انگیز ہو مگر تقسیم ملک اور فسادات اُس کے ساتھ اس طرح جڑے ہیں جس طرح گوشت سے ناخن۔

اس مضمون میں اردو افسانے کا 1907 سے 1947 تک کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں اردو افسانے کے میلانات و رجحانات کے ذکر کے ساتھ ان افسانوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ 'تحریکِ آزادی' کے موضوع کو برتا گیا ہے۔ بعض افسانے جن میں 'تحریکِ آزادی' کو براہِ راست پیش کیا گیا ہے، فنی اعتبار سے اس قدر کمزور ہیں کہ ان کا ذکر لاحاصل ہے۔

'تحریکِ آزادی' یا 'انقلاب' سے متعلق جو افسانے لکھے گئے وہ موضوعی ہونے کے باوجود ادب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں جن کا مطالعہ نئی نسل کے لیے اس لیے ناگزیر ہے کہ یہ افسانے اُن کے دلوں میں جذبۂ حب الوطنی کو زندہ رکھنے کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں۔

603-B، نیو آکاری ایچ ایس
بالمقابل حیدری مسجد، نیا نگر
میرا روڈ [ایسٹ]، تھانے-401107
zahirzahida@gmail.com

***

بقیہ: سیّد عبد العلی عادل

صفحہ ۳ سے آگے

رخ پر نظرِ بد کے لیے تل نہ لگاؤ
دولت کے کہیں دزد نگہباں نہیں ہوتے

عادل اپنی رودادِ محبت اور کیفیاتِ عشق کو بڑے پُرلطف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ غزل کی روایات کے احترام و التزام نے ان کے کلام کو چار چاند لگا دیے ہیں، عادل کو اپنی اس طرز پر بڑا ناز تھا، اس لیے ان کے اکثر اشعار میں شاعرانہ تعلّی موجود ہے۔ تاہم طبیعت کی انکساری ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے:

ہے بڑا بخت کہ بزمِ شعرا میں عادل
اب پسندیدہ ہوا میرا سخن چھوٹا سا

اس شعر میں شاعرانہ تعلّی دیکھیے:

مشاعرہ میں تخلص ہیں سب دوسرے پڑھیں غزل
زورِ فکر اپنا دکھا دو عادلِ سلیمانہ طبع

اور یہ شعر:

اور کوئی بحر میں تحریر کر عادل غزل
طبع سے تیری نہ یہ کچھ بات چنداں دور ہے

غزل ہو یا نظم، مثنوی ہو یا مرثیہ، قصیدہ ہو یا قطعات، عادل ہر مقام پر منفرد نظر آتے ہیں۔ عادل ناگپوری کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عادل قادر الکلام شاعر تھے اور ان کا کلام دہلی اور لکھنؤ دبستانوں کا حسین و پُربہار امتزاج ہے۔

'حیات منزل' نمبر ۹، راٹھور لے آؤٹ
انت نگر، ناگپور-13 (مہاراشٹر)

□□□

بقیہ: حمیدہ سلطان احمد

صفحہ 8 سے آگے

فکر و فن کے دائرے میں ان ادبی فتوحات کا ایک آئینہ ہے جس میں آپ کا مطالعہ، مشاہدہ اور فکر کی جھلک اس طرح آتی ہے کہ اب اس کی پیر دہلی کی تہذیب و تاریخ کے اُس دور کا منظرنامہ بن جاتی ہے جسے آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ادبی شعور کے ساتھ پرکھا۔ حمیدہ آپا ایک بلند آواز خاتون تھیں۔ آواز کی اس بلندی کا تعلق ان کی صاف گوئی اور بے باکی سے ہے۔ شاید اسی وجہ سے کچھ لوگ ان سے ناراض بھی رہتے تھے لیکن انھوں نے دل میں کبھی رنجش نہیں رکھی اور بہت جلد ایسی باتوں کو بھول بھی جاتی تھیں۔ وہ نیک دل اور ملنسار خاتون تھیں اور سب کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھیں۔ اس لیے وہ سب کے ساتھ بغیر کوئی عہدہ لیے وابستہ رہی ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ میں غالب میوزیم کو شروع کرتے میں انھوں نے بھرپور مدد کی۔ غالب اور غالب کے دور کی کئی چیزوں کو اکٹھا کیا اور میوزیم کو سونپا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جتنی بھی ادبی محفلیں ہوتی تھیں اُن میں خاص کر شریک ہوتی رہتی ہیں۔ حمیدہ آپا کی یادداشت قابلِ تعریف تھی۔ غالب کے بارے میں انھوں نے جو باتیں اپنے بزرگوں سے آج سے ساٹھ ستر سال پہلے سنیں انھیں پشتوں کے لیے قلم بند بھی کیا۔ انھیں اُن کی ادبی خدمات کے لیے دہلی اور اترپردیش اردو اکادمی کی طرف سے انعامات بھی ملے لیکن انھوں نے انھیں یہ کہہ کر لینے سے منع کر دیا کہ جب تک اردو کو اس کا اپنا مقام نہیں ملتا وہ سرکاری اعزاز نہیں لیں گی۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی انھوں نے اپنی ادبی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آنے دی اور گاہ بگاہ وہ اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے ایسے ہی ملنے والوں سے بات کرتی تھیں۔ ان خدمات کے لیے اُن کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ حمیدہ آپا کو غالب انسٹی ٹیوٹ سے بڑا لگاؤ تھا جس کی دو وجہ تھیں پہلی یہ کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اُن کے محترم برادر سابق صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کی قابلِ ذکر یادگار ہے۔ دوم غالب اُن کے محبوب شاعر تھے اور اس ادارے میں غالب پر کام ہو رہا ہے۔ وہ جب تک زندہ رہیں ادارے کی مختلف کمیٹیوں سے وابستہ رہیں۔ ادارے کی ترقی سے خوش ہوتیں۔ حمیدہ آپا کی شخصیت میں یقیناً ایک طرح کی سلطانی تھی۔ ان سے پہلی ملاقات میں ہر شخص مرعوب ہو جاتا تھا۔ چناں چہ اس کا ثبوت ایک غیر ملکی سیاح William Dalrymple کی مقبولِ عام تصنیف Delhi: The City of Djinns جو اس نے ۱۹۹۳ء میں لکھی تھی اس نے حمیدہ آپا کے بارے میں اپنے تاثرات کو جن الفاظ میں قلمبند کیا ہے اس کا اردو ترجمہ پیشِ خدمت ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں:

"اکتوبر میں ایک دن میں اور اولیویا (جو اُس کی بیوی تھی) اتفاقاً علی منزل جا پہنچے جو بیگم حمیدہ سلطان کا دولت کدہ تھا۔ یہ دہلی کی آخری حویلیوں میں سب سے اعلا درجے کی ہے جو اب تک پرانے انداز میں آباد ہے۔ بیگم حمیدہ سلطان اپنی سب سے چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھی تھیں جو خاموش تھیں۔ سامنے ساگوان کی ایک بڑی سی میز بچھی تھی۔ وہ موٹا سا سوتی پاجامہ پہنے تھیں لیکن تن کر بیٹھی تھیں گویا ان کی رگوں میں مغلیہ خون کی باقیانہ رعونت کی رمق ابھی تک باقی تھی۔ اُن کا رنگ گورا تھا اور چہرہ دلکش اور رئیسانہ جو کبھی یقیناً بہت حسین رہا ہوگا۔ پر اب اس پر غصہ کے پیچ و تاب کی شکنیں نمایاں تھیں۔ زمین پر گرے کرکٹ اور گرد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا، ہمارے ہاں کوئی ملازم نہیں۔ پچھلا ملازم دو سال ہوئے مر گیا۔ انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، میں اور میری بہن گھوڑے والی شکرم میں کوئین میری اسکول (Qveen Mary's School) جایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارا گھر ادیبوں، گویوں، سیاست دانوں اور شاعروں سے بھرا رہتا تھا۔ آنے جانے والوں کو بیرونی صحن میں داخلہ کے لیے بھی پہلے سے وقت لینا پڑتا تھا۔ ہمارے یہاں کم سے کم پچاس ملنے والے روز آیا کرتے تھے اور اب، یہ کہتے کہتے اُن کی آواز مدھم ہوتی گئی، اس تقسیم نے ہماری دہلی اور ہماری اردو کو تباہ و برباد کر دیا۔

میں نے پوچھا، کیا آپ کو تقسیم اب یاد ہے۔ انھوں نے جواب دیا ہم شیلانگ میں تھے جب واپس آئے تو دیکھا کہ ہمارا مکان بُری طرح لوٹ لیا گیا تھا۔ باورچی بھاگ گیا، مالی مارا گیا، ہمارے عزیزوں میں صرف لوہارو خاندان اور نواب چھتاری بچے تھے باقی سب پاکستان بھاگ گئے۔ انھوں نے سر ہلایا اور کہنے لگیں مجھے دہلی سے محبت تھی لیکن اب دہلی مردہ شہر ہے۔

میں نے سوال کیا اس سے کیا مراد ہے آپ کی؟

انھوں نے جواب دیا "دہلی کے قدیم باشندے اب خال خال باقی ہیں۔ پردیسیوں نے شہر سنبھال لیا ہے۔ حتیٰ کہ اب ہماری زبان بھی مردہ ہے۔ میں نے کہا "لیکن دہلی میں بہت سے لوگ آج بھی اردو بولتے ہیں۔"

انھوں نے کہا: اردو ایک مہذب زبان ہے کرخنداروں کی زبان نہیں ہے۔ اب جو باقی رہ گئے ہیں وہ کرخندار (دستکار اور کاریگر) ہیں اور کرخنداری بولی بولتے ہیں۔ شاعروں کی زبان اردو تو مردہ ہے ایک مریل سی بلی جو بیگم صاحبہ کے پیروں میں لپٹی بھوک سے میاؤں میاؤں کر رہی تھی کود کر میز پر چڑھ گئی اور ناز و انداز سے اُن کی انگلیوں کی ابھری ہڈیوں سے اپنا جسم سہلانے لگی۔ بیگم صاحبہ اسے پرے دھکیل کر بولیں "تقسیم دہلی کے لیے ایک بڑا حادثہ تھا، جو رہ گئے وہ بُری حالت میں ہیں اور جو بُری حالت میں ہیں۔ دہلی کا امن و امان گیا۔ اب سب کچھ گیا۔

اولیویا (جو اُن کی بیوی تھی) نے پوچھا "کیا ہم پھر آ سکتے ہیں اور آپ سے مل سکتے ہیں اور کیا آپ کو کوئی دہلی سے کسی چیز کے منگانے کی ضرورت ہے۔ بیگم صاحبہ نے حکمت سے جواب دیا 'ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں اور نہ پھر آنے کی ضرورت ہے۔' وہ رکیں اور پھر بھرائی آواز میں سرگوشی کے لہجے میں کہا "میں بس یہ چاہتی ہوں کہ لوگ مجھے بھول جائیں۔"

اس انٹرویو سے اندازہ ہوگا کہ حمیدہ آپا کو ملک کی تقسیم، دہلی کی تباہی اور اردو کی بربادی کا غم شدید تھا۔ ملک کی تقسیم کی وجہ سے اردو زبان کے نام اور ناموس پر جو قہر پڑا وہ اس کی بدنصیبی کا تاریک ترین باب تھا۔ اس دور میں دہلی کی لسانی زندگی اور روایت پر بھی بھاری اثر پڑا۔ اس کی روک تھام اور بچاؤ کے لیے دہلی کے جو چند باہمت اشخاص آگے آئے ان میں حمیدہ آپا پیش پیش تھیں۔ آپ جب تک زندہ رہیں اردو زبان کو بڑی دلسوزی اور رغبت سے اجاگر کیا اور اس کام کے لیے قلم اور گفتار دونوں سے پُراثر کام کیا۔ آخر میں یہ کہہ کر اپنی بات ختم کروں گا کہ حمیدہ آپا جب تک زندہ رہیں اردو کے لیے بے حد مخلص رہیں۔ انھوں نے دلی کی انجمن ترقی اردو کو ہمیشہ سرگرم رکھا اور دلی میں اردو کو اس کا حق دلانے کے سلسلے میں بھی وہ اپنے سماجی اور ادبی قد و قامت کا اثر ڈالتی رہیں اور لالہ شام ناتھ، گوپی چند امن، مرزا محمود بیگ، میر مشتاق، منشی عبد القدیر اور میتھو بدیال وغیرہ کو اردو کے لیے کچھ کرنے کے لیے آمادہ کرتی رہیں۔

K-302، تاج انکلیو، گیتا کالونی
دہلی-110031
shahid_meyar@hotmail.com

●●●

حمیدہ سلطان احمد

دہلی کی تہذیب کا آخری نمونہ

شاہد ماہلی

حمیدہ سلطان احمد دہلی کے ایک عالی خاندان کی فرد تھیں، جس خاندان کا ہر فرد اپنی ذات سے ایک انجمن تھا اور آپ کی ذات خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ نواب زین العابدین خاں عارف کی چوتھی پشت میں تھیں اور عارف خود الٰہی بخش خاں معروف کے نواسے اور غالب و بیگم غالب کے منہ بولے بیٹے تھے۔ نواب عارف کے دونوں بیٹے باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں، غالب اور بیگم غالب ہی کے سایۂ عاطفت میں پلے بڑھے اور ان کی ادبی نشو ونما ہوئی تھی۔ آپ کی نانی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کی دختر نیک اختر تھیں، اور غالب کی زندگی ہی میں ان کے گھر باقر علی خاں کی دلہن بن کر آئی تھیں۔ یہاں ان کے لیے بڑا اعزاز اور باقر علی خاں کامل کے لیے فخر و ناز کی بات تھی کہ وہ اس عالی مرتبت امیر کے داماد اور اس نسبت سے جو ایک سے زیادہ رشتوں کے ساتھ انہیں حاصل تھی، حمیدہ سلطان دہلی کے ایک مشہور محلے گلی قاسم جان کی اس حویلی میں ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئی تھیں جو نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کی ملکیت تھی۔ نیر درخشاں، نواب احمد بخش والی فیروز پور جھرکہ و لوہارو کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔

آزادی کے بعد جن لوگوں نے اردو زبان کے تحفظ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ ان میں حمیدہ سلطان جنہیں لوگ پیار سے حمیدہ آپا کہتے تھے، کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ آپا نے صرف زبان کے تحفظ ہی کے لیے جدوجہد نہیں کی بلکہ اردو زبان و ادب دونوں کی ترقی و فروغ کے لیے بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ پچھلے پچاس سال کی دہلی کی ادبی تاریخ لکھتے ہوئے مورخ آپا کی بے لوث خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ آپا پچھلے پچاس سال سے انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی شاخ کی سکریٹری تھیں۔ انھوں نے کوشش کر کے انجمن کے لیے علمی منزل نام کی ایک عمارت حاصل کی۔ علمی منزل کا باقاعدہ ایک ٹرسٹ ہے جو اس عمارت کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ آپا اس عمارت کے ایک حصے میں رہتی تھیں۔ پچھلی پانچ دہائیوں کے دوران علمی منزل کو غیر معمولی اہمیت رہی ہے۔ اردو کا کون سا مشہور، ممتاز اور صف اول کا ادیب اور شاعر ایسا ہے جو دہلی میں رہتا ہو یا دہلی آیا ہو اور انجمن ترقی اردو (دہلی) کے زیر اہتمام پابندی سے منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں شریک نہ ہوا ہو۔ مجاز، روش صدیقی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، جسٹس آنند نرائن ملا، مجاز لکھنوی، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، بہار برنی، ساغر نظامی، ذکی ساغر، عزیز وارثی، بیگم ممتاز مرزا، اسلم پرویز، بتول سعیدی، گوپال متل، محمود سعیدی، رفعت سروش وغیرہ علمی منزل کی ادبی محفلوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔

محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ ایک قابل عزت ادیبہ تھیں، وہ متعدد علمی و ادبی تصانیف کی مالک تھیں۔ انھوں نے ادب کی مختلف شاخوں میں یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ خاندان لوہارو کے شعراء پر ان کی مشہور کتاب ہے جو غالب انسٹی ٹیوٹ سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ اس میں لوہارو خاندان کے ۱۳ شاعروں کا مختصر حال درج ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں بڑا مستند مواد حاصل تھا اس بنا پر یہ کتاب نہایت معتبر ہے۔ اس کتاب میں بعض ایسی معلومات ہیں جو کہیں اور مشکل ہی سے مل سکتی ہیں۔ آپ دہلی کی ان نادر روزگار ہستیوں میں شمار ہوتی تھیں جنھوں نے یہاں کی تہذیب و تمدن اور اردو زبان و ادب پر ناقابل فراموش نقش مرتسم کیے ہیں۔ غالب شناسی میں ان کا کارنامہ زریں الفاظ میں لکھنے کے لائق ہے کہ انھوں نے غالب کی یوم وفات پر مزار پر پھول چڑھانے اور فاتحہ پڑھنے کی رسم کا آغاز کیا۔ یہ تقریب اب ہر سال ہوتی ہے اور امید ہے کہ صدیوں تک جاری رہے گی۔ اس سلسلے میں حمیدہ آپا کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے اردو ادب میں بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے خاصہ کی چیز ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی ان کی ادبی زندگی کا آغاز ناول نویسی سے ہوا۔ ''ثروت آرا'' ان کا پہلا ناول تھا جو ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا اور اس زمانے میں خاصا مقبول ہوا۔ ''رنگ محل'' ۱۹۹۰ء میں ان کا دوسرا ناول شائع ہوا تھا۔ اس پر سہیل عظیم آبادی نے ایک مفصل پیش لفظ لکھا تھا جس میں اس ناول کی زبان کی خاص طور پر تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا:

''رنگ محل، ایک دلکش تصویر ہے ان رنگا رنگ اقدار کی، اس تہذیب کی جو اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔''

ان کا آخری ناول جو زیور طبع سے آراستہ ہوا وہ 'بہار و خزاں' ہے جو کئی سال پہلے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ وہ تنقید و تحقیق کی وادی سے بھی واقف تھیں۔ حمیدہ سلطان صاحبہ کا آخری مضمون جو میری نظر سے گزرا وہ ''آکا بھائی'' ہے جو انھوں نے فخر الدین علی احمد مرحوم پر لکھا تھا اور یادگار نامہ فخر الدین علی احمد میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد علمی و ادبی مضامین اور افسانے اردو کے مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مدتوں وہ ''صبح'' نام کا ایک رسالہ بھی نکالتی رہیں۔

آپ کی ادبی خدمات کا درخشاں دور نصف صدی سے زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس اثناء میں آپ نے اردو فکشن کو کچھ ایسے ادب پارے دیے جو آپ کے نام کی نسبت سے عطیۂ حمیدہ بھی کہے جا سکتے ہیں۔

آپ کے افسانوں کا مجموعہ ''نیلا امبر'' بھی ہے، جو اس تہذیب اور (بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو میں بچوں کے ادب پر گراں قدر انعامی مقابلے

بچوں کے ادبی ٹرسٹ نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی سرپرستی اور تعاون کے ساتھ بچوں کے [اردو] ادب پر دو سال میں ایک بار گراں قدر انعامات دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ انعامات صرف نثری تحریروں کے مسودوں پر دیے جائیں گے، مطبوعہ ادب پر نہیں۔ ان مقابلوں کا اصلی مقصد اردو میں بچوں کے ادب میں اوریجنل، جدید اور اچھے مسودے حاصل کرنا ہے۔ بعد میں ان کی شایان شان اشاعت کی کوشش بھی کی جائے گی۔ انعامات کی رقم پچاس ہزار سے پندرہ ہزار روپے تک متوقع ہے۔

اس سلسلے کا پہلا انعامی مقابلہ سال 2016 میں منعقد ہوگا۔ مسودے جمع کرنے کی آخری تاریخ 2016 کے ابتدائی مہینوں میں متوقع ہے۔

مقابلوں میں ملک اور بیرون ملک کے ادیب بلا شرط عمر حصہ لے سکتے ہیں۔

مقابلوں میں شرکت کی شرائط اور دوسری تفصیلات کا جلد ہی اعلان کر دیا جائے گا۔

بچوں کے لیے لکھنے والے مندرجہ ذیل زمرۂ عمر کی مناسبت کو ذہن میں رکھ کر تیاری شروع کر سکتے ہیں۔

زمرۂ عمر

3 تا 6 سال (تصویری کہانی، بنیادی تصوریتی Concept Book)
6 تا 9 سال (فکشن / نان فکشن)
9 تا 12 سال (فکشن / نان فکشن)
12 تا 16 سال (فکشن / نان فکشن)

مزید معلومات کے لیے سید غلام حیدر [سابق سکریٹری بچوں کا ادبی ٹرسٹ، نئی دہلی] اور محمد ساجد [انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی] سے مندرجہ ذیل فون نمبروں پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے:

فون نمبر (سید غلام حیدر): 9718875214, 011-26331766
(محمد ساجد): 9811716909

مدیر: اطہر فاروقی — Editor: Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں — Joint Editor: Mohd. Arif Khan
پرنٹر و پبلشر: عبدالباری — Printer, Publisher: Abdul Bari
مطبوعہ ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
Printed at: Samar Offset Printing Press, Delhi
مالک انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
Proprietor: ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002
قیمت (فی شمارہ) تین روپے، سالانہ: ۱۲۵ روپے (بیرونی ممالک آٹھ امریکن ڈالر)
Subscription: (Per Issue) Rs. 3/-. Yearly: 125/- (Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org Phones: 23237212, 23237214